دستک
روبینہ فیصل
rubyfaisal@hotmail.com

بے بسی

لکھنے کو بہت کچھ تھا۔۔فلسطین کے لوگوں پر عید والے دن بھی موت گولے برسا رہی تھی۔بچے عورتیں سب اس آگ میں جل رہے تھے ۔ ایک طرف عورتیں ہاتھوں میں خون آلود بچے اٹھائے آسمان سے فریاد کر رہی تھیں۔اور دوسرے طرف اسی آسمان کے نیچے عورتیں ہاتھوں میں مہندی لگائے خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔

لکھنے کو بہت کچھ تھا۔۔ایک طرف وزیرستان کے بے گھر لوگ ننگے آسمان تلے عید کی خوشیاں ڈھونڈ رہے تھے اور ایک طرف اسی ملک کے حکمران جنہوں نے ان کی تقدیر کا فیصلہ کیا تھا، خانہ کعبہ میں رب کے حضور بیٹھے لوگوں کو صبر کی تلقین اور خدا پر کامل یقین رکھنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

ایک طرف اسی دنیا میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کا قصور بتائے بغیر گھر کے اند مذہب کے نام پر جلا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسی ملک کے لوگ عید کا جشن منا رہے ہیں۔میرے منہ سے عید مبارک کا لفظ نہیں نکل رہا۔رسمِ دنیا نبھانے کو ٹیکسٹ میسج پر کچھ عید مبارک کے پیغامات لکھے پھر سوچا کیسی عید؟ کہاں کی عید؟ کیا اس دنیا میں عید منانے کا کوئی حال رہ گیا ہے؟

اسی عید سے پہلے مجید نظامی صاحب رمضان کے بابرکت مہینے میں صحافت کو تنہا چھوڑ گئے۔اس دنیا کے رنج و غم سے منہ موڑ گئے۔خدا ان پر اپنی رحمتیں کرے۔ان کے بارے میں بھی لکھنے کو بہت کچھ تھا۔

میری بہن کے بغیر پہلی عید تھی۔لوگ پھر بھی عید کی مبارک دے رہے تھے۔کھانے کی دعوتیں دے رہے تھے۔یہ سب ان کا پیار مگر میرا دل ڈسکہ کی شہزادی کی طرف چلا گیا۔کرنے کو بہت کچھ تھا، کہنے اور لکھنے کی طرح مگر میں west park health care centre چلی گئی۔کیونکہ شائد صفیہ مریم نے یہ ڈسکہ کی اس شہزادی نے میری طرف سے ہی لکھا تھا:

جب میں تمھیں ملوں گی
تو محبت نہیں
عیادت کروں گی
اُس محبت کی
جو تمھیں
مجھ سے ہے!

میری زندگی میں چونکہ شور بہت زیادہ تھا اس لئے مدہم آواز کان میں نہیں پڑتی تھی۔اپنا آپ بھی نہیں سنتی تھی۔بس میلے میں گُم رہتی تھی۔ مگر جب اپنے ہاتھوں سے، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن کا آخری سانس جسم سے نکلتے دیکھا۔گرم جسم کو ایک دم ٹھنڈے ہوتے دیکھا تو زندگی کے شور اور میلے ایک دم خاموش ہو گئے۔14 دسمبر 2013 کے بعد میں نے اپنی آوازوں اور مدہم آوازوں کو سننا شروع کیا تو یاد آیا کسی دوست نے بتایا تھا صفیہ آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔میں نے ہنس کر شکریہ کہا تھا اور اگلے ہی لمحے بھول بھی گئی تھی۔

صفیہ سے سرسری ملاقات ہمیشہ بہت شور میں ہوئی ایک ایسی ہی ادبی محفل میں جب صفیہ نے اپنا کوئی مضمون ختم کیا تو میں نے اسے ایک اچھا مضمون اچھی ادائیگی کے ساتھ پڑھنے پر مبارک دی تو اس نے بہت نوابی سٹائل سے مجھے " شکریہ " کہا۔بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، مغلیہ نقوش، دراز قد اور سب سے بڑھ کر سائیڈ پر جھولتی ایک بل کھاتی زلف۔۔یہ سب چیزیں مجھے بہت دھیمی اور کسی اور دنیا کی

لگیں۔ میرے شور شرابے نے مجھے اسی ایک لمحے میں ہم دونوں کی شخصیات کا فرق بتا دیا۔ میں نے سوچا اس سے زیادہ ہم میں بات نہیں ہو سکتی۔

بعد میں ایک دو دفعہ کبھی فون پر کبھی آمنے سامنے بات ہوئی۔ دو چار جملوں سے زیادہ تبادلہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اتنا آہستہ میں نہیں جا سکتی۔ پھر بھی اس کے محبت بھرے جملے مجھ تک کسی تیسرے کنارے سے ہو کر پہنچتے رہے اور میں نے ذرا بھر بھی دھیان نہ دیا۔

آج عید کا دوسرا دن ہے اور کہنے کو بہت کچھ ہے مگر میں جو کل عید پر کہیں اور جانے کے قابل نہ تھی صرف ڈسکہ کی شہزادی صفیہ مریم کو مل کے آئی ہوں۔ جو ہر دوسرے حساس مہاجر کی طرح ہجر کا کرب محسوس تو کرتی تھی مگر اُس نے ایجکس کینڈا میں بھی ڈسکہ آباد کر لیا تھا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے شہروں کو کینڈا میں بھی آباد کر لیا ہو۔ صفیہ اپنی کتاب "موسم ہجر" میں لکھتی ہے "ٹھنڈی نہر کے کنارے واقع میٹھے پانیوں کے شہر ڈسکہ کی طرح ایجکس بھی جھیل کنارے واقع ہے" اور ہم جو تصور میں بھی کینڈا اور پاکستان کے بڑے شہروں کا موازنہ نہیں کر سکتے وہ بڑی سہولت بھول پن اور مان سے لکھتی ہے" یہاں ڈسکہ کی طرح شہر کی ساری سہولتوں کے ساتھ گاؤں کا سکون بھی ہے"۔

ڈسکہ کی یہ "بڑی بی بی" گھر میں لاڈلی ہونے کی وجہ سے جس کا حکم چلتا تھا۔ بے بسی کی تصویر بنی ہسپتال میں بے جان پڑی ہے۔ مگر آنکھیں ہیں کہ بولتی ہی جا رہی ہیں۔ میں جب کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے ایک لمحے لگا ہی نہیں کہ وہ کسی موذی جادوگر مرض میں مبتلا ہے جس نے اس خوبصورت شہزادی کے جسم کی تمام حرکت پر جادو کر کے اسے ساکن کر دیا ہے۔ کہانیوں میں پڑھتے تھے کہ شہزادے کے لمس سے جادو کا طلسم ٹوٹ گیا اور شہزادی متحرک ہو گئی۔ مگر یہاں اس کا شہزادہ (اعجاز بھائی) اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لئے سہلا رہے ہیں مگر طلسم ہے کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ کہانیاں کتنی جھوٹی ہوتی ہیں۔ میری آنکھیں آنسوؤں کا راستہ روکنے میں ناکام ہو گئیں۔ وہ جو میرا چہرہ دیکھ کر کھل اٹھی تھی ایک دم مرجھا گئی۔ ہائے او ربا!! سب کچھ مفلوج کر دیا مگر بہتے آنسوؤں کو نہ روک سکا تُو۔ میں نے اس کی آنکھوں کے کنارے خشک کئے، اپنے آنسوؤں کو پیا، مجھے نہیں پتہ میرے اندر کا اور باہر کا شور کیسے کم ہو گیا، میں جو اس کا مدہم لہجہ بھی سمجھنے سے قاصر ہوتی تھی۔ آج اس پر جھکی اس کی خاموشی سے باتوں پر باتیں کرتی جا رہی تھی۔

ASL یا ALS پتہ نہیں کیا منحوس مرض ہے، مجھے اس کا نام جاننے کی ضرورت بھی نہیں، جس نے جیتی جاگتی عورت کو پچھاڑ دیا ہے۔ صفیہ نے پرانی ڈسکہ کی یادوں کے ساتھ یہاں بھی چھوٹا سا گھر خوشی خوشی بنا لیا تھا۔ جس کے چار خوبصورت بیٹے ہیں اور وہ جن کے ساتھ عید پر اپنے گھر ہونا چاہتی ہے۔ اسکی آنکھیں مجھے بتا رہی ہیں روبینہ میں انہیں شلوار قمیض پہنا کر مسجد بھیجنا چاہتی تھی، سویاں پکانا چاہتی تھی اور انہیں عیدی دینا چاہتی تھی اور جانتی ہو بڑے بیٹے میں اپنے پیار کرنے والے ابو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ میں کب ٹھیک ہونگی؟ ہونگی بھی یا یونہی خاموشی سے۔۔۔؟

نرسوں نے اسکے ہاتھوں پر تازی تازی نیل پالش لگائی ہوئی ہے۔ وہ مجھے کہہ رہی ہے مجھے مہندی بھی لگانا تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ شوخ رنگوں میں میک اپ کئے ہی دیکھا تھا۔ میں اسے کہتی ہوں تمھارے چہرے کو میک اپ کی ضرورت نہیں۔ بیماری میں لوگوں کے چہرے بدل جاتے مگر تم مزید خوبصورت ہو گئی ہو۔ صفیہ کی آنکھوں نے قہقہ لگایا۔ اس کی نئی شاعری کی کتاب جو میرے ہاتھ میں تھی پہلا شعر ہی بول پڑا:

دیکھتے ہی دیکھتے، گذر گئیں سبھی رُتیں
کڑے عذاب ہجر کے، وصال کی مسرتیں

اعجاز بھائی stephen hawkin کی مثال دے کر، صفیہ کا ہاتھ دبا کر کہہ رہے ہیں میرا بچہ بھی بہت بہادر ہے۔ فیصل دعا کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں انشااللہ ٹرائل دوائی سے معجزہ ہو جائے گا۔ صفیہ کی آنکھوں سے پانی بہتا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے کنارے ہیں کہ ہنستے ہوئے بھی خشک نہیں ہو رہے۔ میں نے اس کے چہرے کو پیار کیا اور اس کی کان کے پاس اپنا منہ کر کے سرگوشی میں کہا دیکھو بڑی بی بی باہر

دنیا میں بچے ماؤں کے سامنے نیزوں پر چڑھائے جا رہے ہیں، زندہ آگ میں جھلسائے جا رہے ہیں، مائیں ننگے سر ماتم کناں رہتی ہیں۔ بچیوں کو بے حرمت کر کے درختوں سے ٹانگنے کا نیا فیشن آیا ہوا ہے۔ مجھ بد بخت کو دیکھو سب دیکھ اور سن رہی ہوں مگر بے جان اور بے بس ہوں، سب حساس لوگ مر مر کر جی رہے ہیں اور تم تو بڑی سیانی نکلی مزے سے ادھر کان لپیٹ کر چپ کا روزہ رکھ کر بیٹھ گئی ہو۔ ڈسکہ کی شہزادی کی آنکھوں میں پہلے خوف پھیلا، پھر تشویش اور پھر بڑے سکون سے اس نے مجھے رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ اور میں اس کی ہمدردی جھولی میں بھر کر آ گئی۔ پتہ نہیں ہم دونوں میں سے زیادہ بے بس کون ہے؟